پروفیسر ریاض حسین

تغلق دور کی ایک عظیم یونیورسٹی

اگرچہ انگریز اور ہندو مؤرخین اپنی تاریخی یونیورسٹیوں آکسفورڈ، کیمبرج، نالندہ اور ٹیکسلا وغ
کا پچھلے سو ڈیڑھ سو برسوں میں خوب چرچا کرتے رہے ہیں اور ان پر ضخیم کتابیں بھی منظرِ عام پر آ
ہیں۔ لیکن مسلمان مؤرخین نے اپنی عظیم درس گاہوں کی مکمل داستان ابھی قلم بند نہیں کی۔ اگر یہ دا
قلم بند ہو جاتی تو جدید یونیورسٹی تعلیم کی ہیئت اور فلسفہ جو کہ مغرب سے مستعار لیا گیا ہے بشمول ا
یونیورسٹی کے تصور کے ہیچ معلوم ہونے لگتا۔

ایک ایسی ہی عظیم درس گاہ کی بھولی بسری داستان قدیم تاریخی کتابوں میں بکھری ہوئی جزئیات
جمع کر کے پیش کی جا رہی ہے۔ مسلم نظامِ تعلیم کی شان دار روایات کی امین اس عظیم یونیورسٹی کا وسیع و
کیمپس کھنڈر کی صورت میں آج بھی دہلی میں ایک نہر کے کنارے (جسے اب تالاب کی شکل دے
گئی ہے) موجود ہے۔

سر سید احمد خاں نے اپنی کتاب 'آثار الصنادید' میں اس کے کھنڈرات کا اجمالی خاکہ پیش کی
اس کے علاوہ ان کھنڈرات کی تصاویر ARCHAEOLOGICAL SURVAY OF INDIA (DELHI VOLUME)
میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اس یونیورسٹی کے بارے میں معلومات کے مستند مآخذ میں سے ایک تو "
مطاہر" ہے جس کے مصنف مطاہر خود بھی اس یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے، اور دوسری
"تاریخ فیروز شاہی" ہے۔

سلطان فیروز شاہ نے ۱۳۵۲ء میں تقریباً ستر ایکڑ زمین پر نہر کے کنارے ایک یونیو
کیمپس تعمیر کیا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں زبردست جنگ میں فتح یاب ہو کر تغلق خاندان دہلی کے تخ
پر قابض ہوا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت شاہی دارالخلافہ کی شاندار عمارات میں سے ایک تھی۔ ب
لکھتا ہے: "اپنی عظیم عمارات، باغات اور خوشگوار ماحول کے باعث اسے دنیا کی شاندار عمارتوں
شمار کرنا مناسب ہوگا۔ بلکہ خوبصورتی میں اگر اسے قیصر و کسریٰ کے محلات پر فوقیت دی جا

تو بے جا نہ ہوگا۔"

ہندوستان، وسط ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ کے ساحلی علاقوں میں اس یونیورسٹی کی عظیم الشان علمی و ثقافتی روایات کی دھوم مچی ہوئی تھی، اور ان تمام علاقوں سے طلبا سینکڑوں کی تعداد میں یہاں قرونِ وسطیٰ کے سائنسی و فنی علوم سیکھنے آتے تھے۔ اس طرح یہ یونیورسٹی ایک بین الاقوامی حیثیت اختیار کر گئی تھی جیسی آج کل یورپ اور امریکہ کی بعض یونیورسٹیوں کو حاصل ہے۔ دنیا کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے علیحدہ رنگوں اور نسلوں کے مسلمان طالب علموں کی موجودگی کی وجہ سے یہ یونیورسٹی ایک بین الاقوامی اسلامی مرکز بھی بن گئی تھی۔

سلطان فیروز شاہ کو تعلیم و ثقافت کی ترویج و ترقی میں گہری دلچسپی تھی۔ اسی لیے حکومت کے اخراجات کا ایک معتدبہ حصہ شعبہ تعلیم کے لیے وقف تھا۔ "دیوان مطاہر" کے مطابق یونیورسٹی کیمپس کے اطراف میں اساتذہ، شاعروں، ادیبوں اور علما و فضلا نے مکانات تعمیر کر لیے تھے، جس سے یونیورسٹی کے علمی و ثقافتی ماحول کا دائرہ اور بھی وسیع ہو گیا تھا۔ یونیورسٹی کی عمارت دو منزلہ تھی، جس میں وسیع برآمدے اور کمرے تھے۔ دروازوں اور کھڑکیوں کا رُخ نہر کی سمت تھا۔ تاریخ فیروز شاہی میں یونیورسٹی کیمپس کا منظر اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

"اس درس گاہ کے چاروں طرف وسیع کھلے میدان ہیں جن پر سرسبز گھاس اور رنگا رنگ پھول اُگے ہوئے ہیں۔ چاروں اطراف میں پختہ اینٹ کی خوبصورت روشیں بنائی گئی ہیں۔ انہی میدانوں میں درختوں کے نیچے اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان علمائے کرام، اساتذہ و طالبانِ علم، درس و تدریس بحث و مباحثہ، گفتگو یا اکا دُکا مطالعے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ اس وسیع سبزہ زار کے درمیان ۱۱ فٹ اونچے پلیٹ فارم پر جامعہ کی عظیم عمارت تعمیر کی گئی ہے، اور اس میں اس قدر رنگ استعمال کیے گئے ہیں کہ سورج کی روشنی میں ان کی چمک سے آنکھیں چندھیا جاتی ہیں۔ بعض جگہ دیواریں شیشہ کی طرح صاف اور اجلی ہیں کہ انسان کا چہرہ بخوبی نظر آتا ہے۔ عمارت کے وسط میں ایک بہت بڑا گنبد ہے۔ اس گنبد اور عمارت کے جنگلوں پر سنہری پتر چڑھے ہوئے ہیں۔" (تاریخ فیروز شاہی)

دیوان مطاہر میں ہے کہ "جب اس بلند و بالا اور عالی شان عمارت کا عکس چاندنی راتوں میں نہر کے پرسکون پانی پر پڑتا تھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنت آسمان سے زمین پر اُتر آئی ہے۔"

اس یونیورسٹی کیمپس میں ایک سو کے قریب لکچر ہال تھے۔ اس کے علاوہ طلبا و اساتذہ کے لیے قیام گاہیں اور باہر سے آنے والے علما و فضلا کے لیے ایک عالی شان سرائے بھی موجود تھی۔ ایک بہت بڑی جامع مسجد، امام صاحبان، مؤذنوں اور خادموں کے لیے حجرے اور گوشہ نشین فقیروں کے لیے عبادت گاہیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ دیوان مطاہر کے مطابق لکچر ہال اور اساتذہ و طلبا کے رہائشی کمروں کے فرش شیراز کے نرم اور آرام دہ قالینوں اور غالیچوں سے مزین تھے۔

یہ یونیورسٹی اعلیٰ علوم کی تحقیقی درس گاہ تھی۔ چنانچہ اس کے اسٹاف میں جید علما اور مشہورِ زمانہ ماہرینِ فنون شامل تھے۔ یہ تمام حضرات اپنے اپنے شعبے میں اعلیٰ مہارت رکھنے کی وجہ سے علم کے امام سمجھے جاتے تھے۔ (دیوانِ مطاہر)

اس یونیورسٹی کے رئیس الاساتذہ (وائس چانسلر) مولانا جلال الدین رومی تھے، جن کے علم و فضل کا چرچا تمام اسلامی دنیا میں تھا۔ (تاریخ فیروز شاہی و دیوانِ مطاہر)

مولانا رومی چودہ علوم کے امام تھے۔ انھیں سات مروّجہ طریقوں سے قرآن کی قرأت پر پورا عبور حاصل تھا، اور مسلمانوں کے چاروں مذاہبِ فقہی کی فقہ پر اُن کی رائے کو مستند مانا جاتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یونیورسٹی کی فضا فرقہ وارانہ محاذ آرائی سے بالکل صاف تھی۔ مولانا رومی تقریباً تمام اسلامی ممالک کا سفر کر چکے تھے اور دور دراز کے ہم عصر علما سے ان کے ذاتی روابط تھے اور مراسلات کے ذریعے مسلسل تعلق قائم رہتا تھا۔ مولانا کی ذاتی لائبریری مروّجہ علوم کے دس ہزار مسودات پر مشتمل تھی۔

سرسید احمد خاں مرحوم اپنی کتاب 'آثار الصنادید' میں لکھتے ہیں کہ اس جامعہ کے رئیس الاساتذہ کا نام سید یوسف تھا جن کا وصال ۱۳۸۸ء میں ہوا، اور جن کی قبر آج بھی یونیورسٹی کیمپس کے کھنڈرات کے درمیان واقع ہے۔ لیکن سرسید احمد خاں نے اپنے بیان کی سند میں کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ بہرحال تاریخ فیروز شاہی اور دیوانِ مطاہر سے مولانا جلال الدین رومی کا اس یونیورسٹی کا سربراہ ہونا ثابت ہے۔

برنی نے یونیورسٹی میں پڑھائے جانے والے علوم کی مکمل تفصیلات مہیا کی ہیں:

یونیورسٹی میں سب سے اہم شعبہ علومِ دینیہ کا تھا۔ جہاں تفسیرِ قرآن، حدیثِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور فقہ کے چاروں مکاتبِ فکر میں اعلیٰ پیمانے پر مطالعے اور تحقیق و تصنیف کا کام کیا جاتا تھا۔

سلطان فیروز شاہ تغلق خود علمِ فلکیات، تاریخ اور طب میں ذاتی دلچسپی اور مہارت رکھتا تھا۔ چنانچہ

یونیورسٹی میں فلکیات اور تاریخ کے شعبوں کے علاوہ ایک طبیہ کالج جس سے ملحقہ ایک بڑا شفاخانہ تھا، قائم تھے۔

"دیوانِ مطاہر" میں لکھا ہے کہ بادشاہ نے حکم دے رکھا تھا کہ اساتذہ کرام درس کے وقت شاہی جبہ اور مصری دستار زیب تن رکھیں۔ تاہم طلبا کے لباس و وضع کے بارے میں خاص احکام یا پابندی کا سراغ نہیں ملتا۔ مطاہر کہتے ہیں کہ اساتذہ اور طلبا کے درمیان قریبی روابط کو کامیاب تدریس کے لیے انتہائی اہم امر سمجھا جاتا تھا۔ جدید یونیورسٹیوں کے برعکس یہ یونیورسٹی کسی بڑی انتظامی مشینری کے بوجھ سے آزاد تھی۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے یہ ایک اوپن یونیورسٹی تھی۔ جس سے ہر کوئی بلا لحاظ عمر و مالی وسائل کے مستفید ہو سکتا تھا۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے عمر کی کوئی قید نہ تھی۔ نہ نصاب کی تکمیل کے لیے کوئی معینہ مدت مقرر تھی۔ چونکہ یونیورسٹی کے تمام اخراجات کے لیے رقوم شاہی خزانے سے مہیا ہوتی تھیں اس لیے طالب علم کو فیس، رہائش اور دوسرے ضروری اخراجات کی ان مقررہ پابندیوں اور مشکلات سے بھی مکمل آزادی حاصل تھی جن سے آج کل کے طلبا دوچار رہتے ہیں۔

یونیورسٹی کے بعض شعبوں کی تدریسی جماعتوں میں طالب علموں کے علاوہ غیر طالب علم شہریوں کو بھی شامل ہونے کی اجازت تھی۔ مطاہر کے بیان کے مطابق "تفسیر، فقہ یا صرف و نحو پر جب بھی مولانا جلال الدین رومی کا درس ہوتا تو طالب علم اور غیر طالب علم شہریوں کا کمرے میں اس قدر ہجوم ہو جاتا تھا کہ دیر سے آنے والوں کے لیے تل دھرنے کو جگہ نہ ملتی تھی۔"

قرونِ وسطیٰ کے مسلم تعلیمی نظام میں اساتذہ اور طلبا کے درمیان چھوٹے چھوٹے حلقوں میں بحث و تمحیص کے ذریعے علوم کی تدریس کے طریقے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ طریقہ آج بھی کیمبرج اور آکسفورڈ میں باقاعدہ طور پر مروج ہے اور اس کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ شیخ سعدیؒ مرحوم نے بھی بغداد کی نظامیہ یونیورسٹی کے نظام و ہیئت کے بیان میں اس طریقۂ تدریس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

یونیورسٹی میں اساتذہ طلبا کو جو شاندار اقامتی سہولتیں میسر تھیں ان کی دلچسپ تفصیلات مطاہر کی زبان سے سنیے:

"رہائشی کمروں میں نرم اور آرام دہ قالین بچھے ہیں۔ بستر، لکھنے پڑھنے کا سامان، کتابیں اور چراغ مہیا ہیں۔ استاد اور مہمان کو مفت مہیا کیے جاتے ہیں۔ کھانے کے کمرے میں دسترخوان پر گوشت

تیتر، بٹیر اور مچھلی کے سالن، اس کے علاوہ گھی میں تلی ہوئی روٹیاں اور قسم قسم کی مٹھائیاں، اچار و مربہ جات کی وافر مقدار رکھی ہے۔ ان تمام کھانوں کے ساتھ ساتھ طعام میں شریک طالب علم و اساتذہ شربت انار کے کئی کئی پیالے پی جاتے ہیں ہیں۔ کھانے کے بعد طلائی ورق لگے ہوئے خوشبودار پان تقسیم کیے جاتے ہیں۔"

برنی کے بیان کے مطابق یہ یونی ورسٹی قرونِ وسطیٰ کے اعلیٰ نظریات کے مطابق طالب علموں کے ذہنوں کی پرورش کے ساتھ ساتھ ان کی روح کی بالیدگی اور نظم کا اہتمام بھی کرتی تھی۔

قرونِ وسطیٰ کی اس عظیم مسلم یونیورسٹی کی یاد میں لکھے جانے والے اس مضمون کا اختتام برنی کے ایک اقتباس پر کرتا ہوں۔

"سلطان فیروز شاہ نے اس درس گاہ کے اخراجات کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے ہیں۔ علما، فضلا، ماہرینِ علومِ دینیہ، سائنس و فنون کے طلبا، اطبا و فلسفی حضرات کے لیے اس جامعہ کے دروازے رات دن کھلے ہیں اور یہاں کے دسترخوانوں پر انواع و اقسام کی نعمتیں ہر وقت ان کی منتظر رہتی ہیں۔ جو کوئی بھی اس مدرسہ فیروز شاہ میں داخل ہوتا ہے اُسے اپنی علمی پیاس بجھانے کا وافر موقع میسر آتا ہے اور اس قدر آرام و آسائش ملتا ہے کہ بے اختیار اس کے دل سے سلطنتِ اسلام کے استحکام، بلند اقبالی و دوام کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔"

اقبال اور سوشلزم

جسٹس ایس اے رحمان

(ریٹائرڈ چیف جسٹس آف پاکستان)

زمانہ حال کے سماجی فلسفوں میں سوشلزم کو ایک ممتاز مقام حاصل ہے۔ پاکستان کے نظریاتی خالق علامہ اقبال نے بھی اپنی تصنیفات میں اس فلسفہ حیات سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔

اس کتاب میں سوشلزم کے اساسی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔

صفحات: ۱۸۰ قیمت -/۱۰ روپے

ملنے کا پتا: ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور